قضیہ سلام کرنے نہ کرنے کا

محمد ظفراللہ

اپنی تو یہ عادت ہے کہ کوئی سوال دماغ میں کلبلا یا اور پڑ گیے اس کے پیچھے ہاتھ دھوکر۔ یہ عادت ہماری کوئی آج کی نہیں۔ جب چھوٹے تھے تو ابا اور اماں کے کان کھایا کرتے تھے۔ اسکول کا کچھ اچھی طرح یاد نہیں کہ کس کس کے کان کھائے، کچھ تو اس لیے کہ ہم نے بہت کم اسکولوں میں چند ماہ سے زیادہ وقت گزارا، بس کلاس پاس کی اور بھاگے، اور کچھ اس لیے کہ اسکولوں میں اساتذہ کو اکثر کان کھینچنے سے ہی فرصت نہیں ہوتی تھی۔

ہاں کالج میں ہم کو چونکہ کالج سے زیادہ رہنے کا اتفاق ہوا اور اساتذہ بھی بہت ایسے ملے کہ وقتی طور پر ہی سہی اماں باوا کو بھی بھلادیا۔ اس لیے سوال پوچھنا اور سوال و جواب کرنا بھی کچھ انہی لوگوں سے زیادہ یاد ہے۔ آج کی نشست کے لیے ہم نے ایسے ہی ایک سوال کا انتخاب کیا ہے۔ پر قبل اس کے کہ ہم اپنی رام کہانی شروع کریں ذرا " کالج میں ہم کو چونکہ کالج سے زیادہ رہنے کا اتفاق ہوا" کی وضاحت ہو جاے ۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم فضل عمر ہاسٹل میں رہتے تھے جوکہ کالج سے ، جیسا کہ اکثر قاریین جانتے ہیں، متصل تھا [بلکہ کالج ہی میں تھا]۔ تو گویا جب کالج نہیں ہوتا تھا، یعنی بند ہوتا تھا، ہم تب بھی کالج میں ہی ہوتے تھے۔ اور ہاں ہم اکثر گرمیوں کی چھٹیاں بھی ہاسٹل ار کالج ہی میں گزارتے پاے جاتے تھے۔

فضیحتا سلام والا کچھ یوں شروع ہوا کہ ہم نے کہیں کسی اخبار میں یہ پڑھ لیا کہ کوئٹہ میں ایک صاحب نے ایک دوسرے صاحب کو سلام کا جواب نہ دینے پر پتھر مار کر زخمی کر دیا۔ کالجوں کے خلاف تو بہت کچھ کہا گیا ہے، مثلا اکبر الہ آبادی کیا خوب فرما گیے ہیں: یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی، پر دکھ کی بات ہے کہ بہت کم لوگوں کو کالج کے حق میں کچھ لکھنے کی توفیق ایسے رنگ میں ہوی کہ حضرت اکبر ، وفات کے بعد ہی سہی، لا جواب ہوجاتے۔ تو صاحبو سنو جو گوش ہوش نیوش ہو، کالج سوچنا سکھاتا ہے۔

ہاں جی کالج سوچنا سکھاتا ہے۔ اب یہ اپنی اپنی افتاد طبع کی بات ہے کہ کوئی سیدھا سوچنا شروع کر دے یا ہماری طرح ہر بات کو ذرا سا مشکل بلکہ ٹیڑھا لے کر اس پر اپنا دماغ اور وقت صرف بلکہ ضایع کرنا شروع کردے۔ ہماری اس افتاد طبع کے ذمہ دار صرف ہمی نہیں تھے بلکہ ہماری بعض تحریروں وغیرہ کو دیکھتے ہوے بعض اساتذہ کا یہ خیال تھا کہ ہم کوی فلسفی وغیرہ بنیں گے بڑے ہوکر۔ بلکہ ہمارے ایک کرم فرما استاد نے تو لے کے ہماری ایک تصویربھی چھاپ دی اس عنوان کے ساتھ: محمد ظفراللہ ہمارے ابھرتے ہوے فلسفی اور ریاضی دان۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

پر خیر ریاضی دان تو بن گیے، بڑے نہ سہی چھوٹے ہی سہی، رہا فلسفہ تو آپس کی بات ہے نہ تب پڑھا اور نہ بعد کو، پر ہمیں ترس تو اپنی پانچویں یا چھٹی کی ان استانی صاحبہ پر آتا ہے، جنہوں نے ہماری ایک ڈرائنگ کو دیکھ کرفرمایا تھا کہ ظفراللہ اگر تم زندہ رہے تو ایک بہت بڑے آرٹسٹ

بنوگے۔ بے چارے اساتذہ، ہر ٹیڑھے بینگے پتھر کو ہاتھ مین لیکر اسکو ہیرا بنانے کے خواب دیکھنے لگتے ہیں۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی فضیحتے سلام والے کی۔ ہم نے یہ سوچا کہ ہمارے معاشرے میں عام طور پر سلام چونکہ بڑے اور صاحب وجاہت لوگوں کو کیا جاتا ہے، اور چونکہ سلام کا جواب دینا گویا سلام کرنے والے کی حیثت کو تسلیم کرنا ہوا۔ ہو نہ ہویہ سلام کا جواب نہ ملنے پرپتھر مارنے کا عمل ہماری معاشرت کے تناظر میں ایک فطری امر تھا۔ اگلا مرحلہ ٹھہرا ایک دھانسو سا سوال مرتب کرنے کا۔ سو یوں ٹھہری کہ ہم وہ خبر سنا کر یہ پوچھیں گے کہ، سلام کا جواب نہ ملنے پر پتھر مارنے کے عمل کے محرکات کیا ہو سکتے ہیں؟

یہ تو کچھ یاد نہیں کہ کتنے حضرات ہمارے اس سوال کا شکارہوے، پر یہ یاد ہے کہ ایک اکثریت کا جواب تقریبایہ تھا " یہ حرکت انتہای احمقانہ ہے اگر مجھے کوئی میرے سلام کا جواب نہ دے تو میں تو اسے پتھر نہیں ماروں گا" اکثر بزرگوں کا انداز کچھ ایسا تھاکہ "تم بھی پتھر نہ مارنا" جہاں کہیں ہمت پڑی ہم نےعرض کیا کہ صاحب آپ تو ماشاءاللہ اتنے پڑھے لکھے ہیں آپ تو ایسی حرکت نہیں کریں گے، پر ایک ان پڑھ دیہاتی کے پاس اتنی عقل ہوتی تویہ خبر ہی نہ بنتی۔ پر آخر میں نتیجہ وہی ڈھک کے تین پات نکلتا تھا کہ سلام کا جواب نہ ملنے پر پتھرنہ مارنا، بری بات ہے۔ اب آپ سے کیا پردہ، گو کہ ہم ایسی باتوں کو توہمات میں گنتے ہیں، اس روز ہم نے سنجیدگی سے یہ یاد کرنے کی کوشش کی کہ صبح کس کا منہ دیکھ کر اٹھے تھے۔

خیر تو جب ہم کالج سے فارغ ہوے تو ہاسٹل کی سوجھی۔ سوچا کہ چلو چوہدری صاحب سے پوچھتے ہیں۔ "چوہدری صاحب" سے ہماری مراد پوفیسر چوہدری محمد علی ہی تھے، اور، اللہ رکھے، ہیں۔ اس زمانے میں چوہدری صاحب ہمارے ہاسٹل کے سپرنٹنڈنٹ تھے۔ چوہدری صاحب کا نام ذہن میں آیا، تو ساتھ ہی دل صاحب نے الارم بجا دیا۔ خیر جب ہر پہلو سے اپنا خاطی ماضئ قریب ٹٹول لیا اور یقین ہو گیا کہ کوئ ایسی قابل تعزیر بات نہیں جس کا علم چوہدری صاحب کو ہونے کا امکان ہوتو اپنی ہمت خود ہی بندھاتے ہوے چوہدری صاحب کی کوٹھی کی جانب چلے۔

کواڑ کھٹکھٹانے پر جب چوہدری صاحب برآمد ہوے توہم نے اپنا مسئلہ بیان کیا۔ وہیں کھڑے کھڑے جو فرمایا وہ تو اچھی طرح یاد نہیں پرتقریبا تقریبا یہ فرمایا: مادی اشیا کے متعلق یہ پیشگوی کرنا کہ بعض خاص حالات مین انکا عمل یا رد عمل کیا ہو گا آسان ہے، جبکہ انسانوں کے ،انہی حالات میں، ردعمل کی پیشگوی کرنا بہت مشکل ہے۔ فرض کرو کہ دو سائکل سوار آمنے سامنے سے آتے ہوئے ٹکرا کر گر جاتےہیں۔ تم سائکلوں کے متعلق تو کہہ سکتے ہو کہ وہ جہاں گرے تھے وہیں پڑے رہیں گے لیکن سائکل سواروں کے متعلق نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اٹھکر ایک دوسرے سے معذرت کریں گے یا لڑنا شروع کردیں گے۔

حق تو یہ تھاکہ ہم اس قدر جامع اور مسکت جواب سن کر خوشی سے ناچنا شروع کردیتے پر ادب مانع ہوا۔ تھوڑا سا افسوس یہ ہوا کہ ہم نے چوہدری صاحب سے پہلے ہی یہ سوال کیوں نہ پوچھ لیا۔ خیر اب پچھتائے کیا ہوت والا معاملہ تھا، اور ہم اپنی غلطیوں پر اتنا پچھتانے والے ہوتے، دوسرے

الفاظ میں اتنے شرم والے ہوتے تو اب تک کب کے اس جہان سے پردہ کر گئے ہوتے۔ شکریہ اداکیا اور دل ہی دل میں اس مثال پر سر دھنتے ہوئے اپنے کمرے کو سدھارے۔

چوہدری صاحب کی دی ہوئ مثال یہاں امریکا آنے کے بعد کئی بار کام آئی۔ ہمارا کچھ عرصے سے یہ معمول ہے کہ جب دماغ کام کرنا بند کر دے تو ہم انٹرنیٹ کا رخ کرتے ہیں۔ کچھ اپنے جیسے کوڑھ مغز چھوٹے لوگوں کی سنتے ہیں اور کچھ اپنی سناتے ہیں، بہانہ تو ریاضی پر بات کرنے کا ہوتا ہے، پر ہر پھٹے میں ٹانگ اڑانا اپنا فرض منصبی جانتے ہیں۔ ایک آدھ بار ایک صاحب نے ایمپیریکل سائکالوجی سے متعلق اپنی معلومات کا مظاہرہ کیا تو ہم نے یہ مثال جڑ دی۔ یوں بھی اکثربعض معاملات میں اپنے دماغ کو ٹھنڈا رکھنے کی خاطر اس مثال کے مختلف پہلووں پر غور کرنے کی مشق کر لیتے ہیں۔ یوں بھی اس مثال کو یاد کرنا ہمارے لئے ایک طرح کے علاج کی صورت ہے کہ چلو ہم تو کچھ نہ بن سکے پر ہم نے استاد تو ایسے ایسے نابغہ ہائے روزگار پائے تھے۔

یہاں یہ عرض کرتا چلوں کہ یہ بس ایک مثال ہے ان جواہر پاروں کی جو کہ ہم نے اپنے اساتذہ سے حاصل کیے۔ اب یہ ہماری کوڑھ مغزی ہی سمجھیں کہ ہم ان سب باتوں کو پلے باندھ کر نہ رکھ سکے۔ ہمارے سبھی اساتذہ ایسے تھے کہ ہر ایک اپنی مثال آپ۔ اب ذرا چوہدری صاحب ہی کو لیں۔ سائکالوجی میں ایم اے کر رکھا تھا، پر کہیں انگریزی ادب پڑھا رہے ہیں اور کہیں فلسفہ کے ادق مضامین کی گتھیاں سلجھا رہے ہیں۔ اردواور پنجابی کے شاعر بھی اعلی پائے کے تھے،اور ہیں۔ اور ان سب پر مستزاد یہ کہ انگریزی اہل زبان کی طرح لکھتے تھے، اور امید ہے کہ اب بھی لکھتے ہوں گے۔ آپ نے سلسلے کی بہت سی کتب کا انگریزی میں ترجمہ بھی کر رکھا ہے۔

وہ بات تو رہی جاتی ہے جس کے حوالے سے ہم نے یہ قصہ سنانا شروع کیا تھا۔ موصوف ہمارے ہاسٹل کے سپرنٹنڈنٹ بھی تھے اور گو کہ بہت ہمدرد بلکہ دستگیر آدمی تھے ڈسپلن کو قائم رکھنے کی خاطر،سخت گیری کا مظاہرہ بھی کر لیتے تھے ۔ بات یہ ہے کہ ہمارے چوہدری صاحب ایک واقف زندگی تھے اور، دوسرے اساتذہ کی طرح، وقف کی روح کو سمجھتےتھے۔ سو ہر ایک کام جو انکو دیا جاتا تھا اسکو کما حقہ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہی روح کارفرما تھی کہ جب کشتی رانی کی ٹیم چوہدری صاحب کے سپرد کی گئی تو چوہدری صاحب نے کشتی رانی کی ٹیم کو بلندی پر پہنچا دیا، جب انکے ذمے باسکٹ بال کی ٹیم ہوئی تو چوہدری صاحب اکثر باسکٹ بال کی ٹیم کے ساتھ پریکٹس کرتے دیکھے جاتے تھے۔ سلسلے کی ایسی بےلوث خدمت کرنے والوں کو اللہ تعالی ایسا فہم بھی اپنی خاص جناب سے عطاکرتا ہے کہ ہم ایسے کٹ ہجتوں، کج بحثوں اور سوال پر سوال کرنے والوں کو مسکت جواب دے سکیں اور انکی رہنمائی بھی کرسکیں۔